کریسنٹ سکول میں پڑھنے والے طارق کے علاوہ اُن دنوں ہمارے رحمت خانے میں ایک اور طالب قسم کا نوجوان بھی آیا کرتا تھا۔ ابھی اس کے پاس ایک سائیکل تھی۔ وہ پڑھائی سے فارغ نہ ہوا تھا اور ریڈیو سٹیشن پر یہ طاہر اور خاں صاحب کے ساتھ جب موقع مل جاتا' صداکاری کرتا۔

اس نوجوان کا نام نعیم طاہر تھا۔

ابھی آرٹس کونسل میں کرتا دھرتا ہونے کا اعزاز اسے حاصل نہ تھا۔ ابھی P.N.C.A. اسلام آباد کی کوئی سنگ نہ تھی..... یہ ساری شناختیں تو مستقبل کے پردوں میں چھپی ہوئی اس کی منتظر تھیں لیکن ایک بات ضرور تھی' نعیم کی آنکھوں میں اس کے رویے میں کچھ کرنے کی آرزو جھلکتی تھی۔ وہ بڑی انکساری سے ہمارے گھر آتا اور کبھی اپنے کام کا ذکر ہم سے نہ کرتا۔

اس کمرے میں جہاں نانا آ کر قیام کرتی تھیں اور جہاں جمیلہ ہاشمی رہ چکی تھیں' وہ آ کر بیٹھ جاتا۔ عجیب بات ہے کہ اس کے آنے پر میرے دونوں بڑے بچے انیق اور انیس آتش دان میں آ کر بیٹھ جاتے اور ہماری باتیں خاموشی سے سنتے رہتے۔ نہ وہ توجہ کے طالب تھے نہ کسی کو انہیں توجہ دینے کا خیال آتا۔ کھانے کا وقت ہوتا تو نعیم کو لے کر خاں باورچی خانے میں آ جاتے۔ بے حد سادہ کھانے محبت سے کھائے اور کھلائے جاتے اور اسی لیے ان میں وہ لذت آ جاتی جو مدتوں اطراف کو یاد رہتی۔

نعیم طاہر کے ساتھ ہی ایک اور یاد بھی رینگتی چلی آتی ہے۔

اور وہ ہے ایلسا باؤسانی۔

جب خاں صاحب فرار ہو کر روم پہنچے اور ISMEO میں اردو پڑھانے لگے تو ان دنوں اسکندریہ باؤسانی جنہیں اطالوی میں Alessandro Bausani کہتے تھے' اُن کے ساتھ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے۔ باؤسانی کو عام طور پر زبانیں سیکھنے کا چسکا تھا۔ وہ اقبال پر کافی بڑی اتھارٹی تھا۔ مشرقی علوم میں اس کی دور رس نگاہ تنقیدی مقالوں کی شکل میں رونما ہونے لگی تھی۔

لیکن بظاہر باؤسانی نہایت سادہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ اطالوی لوگوں کی طرح دونوں بازو کھول کر جب یہ کہتا: "ماما میا۔ mama mia" تو یقین آ جاتا کہ واقعی وہ کچھ نہیں جانتا۔ بھاری جسم پر بجھے بجھے رنگوں کے کپڑوں میں ملبوس باؤسانی کو ہر وقت ایلسا کی ضرورت رہتی۔ یوں لگتا جیسے وہ ایلسا کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اگر ایلسا پاس ہوتی اور باؤسانی آ کر مجبور صورت اسے دیکھتا تو ایلسا سب کچھ چھوڑ کر بھاگتی۔

ایلسا اطالوی عورتوں کی طرح خوبصورت اور دلکش تھی۔ پتی دھرم اس پر ختم تھا۔ باؤسانی کی ضرورت کے آگے اس کی اپنی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے رب نے باؤسانی کی بیساکھی بنا کر بھیجا تھا۔ ایلسا میں محبت والی روح تھی۔ وہ جس سے ملتی بڑی جلدی گھل مل جاتی۔ بچوں سے بھی اس کا یہی رویہ تھا۔

"نوکی صاحب کھانا کھالیا؟"

"کیسی صاحب آپ کیا لکھ رہا ہے؟"

ٹوٹی پھوٹی اردو میں بچوں سے رابطہ قائم کر لیتی۔ جب خاں صاحب گھر ہوتے تو یہ تینوں فرفر اطالوی بولتے' کندھے اُچک کر ہاتھوں کو فعال کر کے' آنکھوں کے اشاروں سے گفتگو میں جان ڈالتے رہتے۔ ان کی اس گفتگو میں ہم خاموش ناظرین کی طرح شامل رہتے۔

"تمہارا شوہر بہت اچھی اطالوی بولتا ہے قدسیہ..... مشکل یہ ہے کہ اس کی اطالوی خالص روم کی ہے اور میں D... کی عورت ہوں۔ مجھے احساسِ کمتری ہوتا ہے Bravo!۔"

ایک روز نعیم طاہر نے ایلسا اور باؤسانی کے ساتھ ہماری دعوت کی۔ مجھے نعیم اور یاسمین کے گھر اس سے پہلے جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ نعیم اور یاسمین کا گھر عجائب گھر سے مختلف نہ تھا۔ یہاں جگہ جگہ پرانے تھال' ظروف' ٹوکریاں' ... سجے تھے۔ جلد ہی خاں صاحب اور باؤسانی نے کسی کی دال گلنے نہ دی اور روم کی باتوں سے شام کو سجا دیا۔

ہم تانگے پر نعیم طاہر کے گھر گئے تھے۔ میں اور ایلسا تانگے کے سامنے اور باؤسانی اور خاں صاحب پچھلی سیٹ پر۔ جس وقت ممن آباد کے عین بازار میں تانگہ پہنچا' ایلسا پر ہنسنے کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے کان کے لوئیں سرخ ہو گئیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"کیا بات ہوئی ایلسا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ دیوانی ہے..... کبھی کبھی اسی طرح ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

بڑی دیر بعد جب تانگہ بازار سے گزر چکا اور کوچوان صاحب اسے کئی بار حیرانی سے دیکھ چکے تو ایلسا نے بتایا کہ اسے جگ پر ہنسی آ رہی تھی۔

"جگ صاحب نے پھر کہا....."

میں آج تک سمجھ نہیں پائی کہ وہ کسی انسان کو جگ کہہ کر پکار رہی تھی کہ کسی ظروف کے پرانے پن پر یوں خندہ زن تھی۔ بس اتنی بات واضح تھی کہ واقعی ایلسا میں بچوں جیسی معصومیت تھی اور وہ اسی معصومیت کے طفیل ہر مقام پر کسی بھی لطف اندوز ہونے کی قوت رکھتی تھی۔

باؤسانی اور ایلسا میں ایک اور بڑی خوبی ان کی Sharing تھی۔ وہ جو کچھ ہو رہا ہوتا اس میں بڑی بے ساختگی سے ... کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ Ideas are not for ever لیکن جو لوگ خیال کو لباس کی طرح تبدیل نہیں کرتے' وہ زندگی کے کھیل کو انجوائے نہیں کر سکتے۔ لباس پہن کر بڑے قد آور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر تولنا چاہیے کہ لباس کا رنگ فیشن تراش خراش کیا مجھ پر جچی کہ نہیں۔ کیا رنگ میری طبیعت کے مطابق ہے؟ ہر ماحول، اور حالات اپنے ساتھ کچھ خیالات لے کر آتے ہیں۔ اگر خیال مثبت ہو اور اس کا ٹکراؤ آپ کے مسلک یا اقدار سے نہ ہو تو ایسے Idea کو ضرور آزما کر دیکھنا چاہیے۔ اس سے آپ کے علم میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے..... "سیروا فی الارض" ایسا ہی ایک مثبت خیال ہے۔ سفر میں آپ کو کئی انسان' جگہیں' کلچر اور اندازِ زیست کی بوقلمونیاں ملتی ہیں۔ آپ کسی بھی سفر پر سیکھنے کے شوق میں جائیں گے تو آپ کو پورا مکتب ملے گا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کلاس بدلتی رہتی ہے۔ آدمی ہمیشہ تختی ہی پر نہیں لکھتا رہتا۔ تختی سے پین' پین سے بال پوائنٹ پھر مہنگی سیاہیوں سے لکھنے والے مہنگے پن..... کبھی فقط پنسل کا سہارا۔

ڈرامے سے ہمارا تعلق پرانا ہے۔

ایک روز بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ کچھ ہیر رانجھا قسم کا کھیل ہونا چاہیے۔ صدیقہ اور جاوید بھی آئے تھے۔ ایلسا کو ہیر جیسا لباس پہنایا۔ ہاتھ میں شیشے کی جڑی پنکھی پکڑائی۔ باؤ سائی کو رانجھا بنایا..... صدیقہ نے ... دھارا۔ جاوید کچھ مانا کچھ نہ مانا۔ لڈی ڈالنے والوں کی طرح گلے میں کیسری دوپٹہ ڈال کر مہینوال بن گیا۔

آنگن کے پچھلے کونے میں تخت پوش بچھایا گیا۔ اس پر ایلسا رانجھے کو پنکھا جھلنے لگی۔ رانجھا صاحب ... اور بانسری پر غلط سلط سر بجانے لگے۔ اس دن کی یاد بڑی خوبصورت تصویروں میں محفوظ کر لی گئی۔

یہ تصویر بھی عجیب چیز ہے؟ دراصل جس شخص نے کیمرہ ایجاد کیا' اسے "یاد" کو محفوظ کرنے کا خبط ... تصویر سے ہرگز رہائی نہیں پا سکتا۔ بڑھاپے میں جوانی کی تصویریں دیکھنا' جوانی میں بچپن کی تصویریں دیکھ کر بچھڑی محبوبہ کی تصویر دیکھ کر پرانے عشق کی سولی پر لٹکنا' پرانے دشمن کی تصویر دیکھ کر واقعے کی اہمیت پر سوچنا' ... باپ' بہن بھائی دوست سب کی تصویروں سے تعلق خاطر کی ہلکی ہلکی پھوار دل پر پڑتی رہتی ہے۔ تصویروں کا اثر ... جیسا ہوتا ہے اور شاید اسی وجہ سے فلم میڈیا میں اتنی کشش ہے۔

تصویروں سے خیال آیا کہ ہماری زندگی میں عبدالرحمن میاں کیمرے کی وجہ سے داخل ہوا۔ اسے ... بنانے کا جنون تھا اور ہم چوری چوری اس پبلسٹی سے خوش ہوتے تھے جو ہمیں ان تصویروں سے ملتی تھی۔

عبدالرحمن میاں منگلا میں انجینئر تھا۔ ان دنوں منگلا ڈیم زیر تعمیر تھا اور رحمن میاں زمین کھودنا اور ... والے چشمے کو بیرون لا کر لوگوں کو پانیوں سے سیراب کرنے کا فن جانتا تھا۔ پتہ نہیں خان صاحب کی رحمن سے ... کیسے ملاقات ہوئی۔ رحمن عام طور پر ہمارے گھر شام کے وقت آتا۔ ایک تخت پوش باہر والے برآمدے میں ... کبھی یہ بوسیدہ تخت پوش پچھلے آنگن میں چلا جاتا۔ کبھی اس کو اوپر چھت پر لے جاتے۔ کبھی یہ باہر گیٹ کے ... ڈال دیا جاتا۔ اچھے دنوں میں جب یہ اصلی مالکوں کے پاس ہوگا تو اس پر موٹی سی پلاسٹک سیٹ لگی ہوگی' لیکن اب ... حال تھا' ایک ٹکڑی کہیں آدھی رکھا رہتا تھا۔

رحمن جب بھی منگلا سے آتا اسی تخت پوش پر سویا رہتا۔ رحمن کا پروفیشن تو انجینئرنگ تھا' لیکن ... فوٹوگرافی اور ادب تھی۔ تصویریں تو وہ بہت اعلیٰ درجے کی کھینچتا ہی تھا لیکن کہانی کہنے میں بھی اسے کمال حاصل ... پہلی کہانی "ویرانے کا پھول" پہلی مرتبہ "داستان گو" میں چھپی اور اس نے قارئین سے بہت داد پائی۔ رحمن ... شاید..... شاید بڑا نام حاصل کرتا لیکن ہر تخلیق کار کی طرح اس کے اندر تنہائی نے جو فتور مچا رکھا تھا' اس کے نتیجے ... لے کر پہلے ثریا کے در پر پہنچا۔ ثریا اس سے اس درجہ متاثر تھی کہ اگر کوئی سواری نہ ملتی تو دودھ والے کے ریڑھے ... رحمن سے ملنے چلی آتی' لیکن یہ حالات تب واقع ہوئے جب ہم 121۔سی میں تھے۔

ثریا کی شادی رحمن سے نبھ نہ سکی۔

رحمن کے اندر کا فنکار پتہ نہیں کیوں دم سادھ کے چپ ہو گیا اور سوسائٹی میں اس کی پہچان اس کی ... بشریٰ رحمن بن گئی۔ جوں جوں بشریٰ پھیلتی گئی رحمن سکڑتا گیا۔ 2007ء میں یا تو رحمن تاشقند میں اپنے ...

...نے میں لگا رہتا ہے یا پھر وہ اپنے گھر کے کسی پچھلے کمرے میں اپنے نفس اور ہمزاد کے ساتھ غلطاں و پیچاں ...تار رہتا ہے۔

...میں 479۔ این کی بات کر رہی ہوں جب رحمٰن پر ابھی شوق کی ترنگ غالب تھی۔ وہ موقع بے موقع ... شوقین تھا۔ ایک مرتبہ عید کا دن تھا۔ رحمٰن کہیں سے آٹپکا۔ مجھے بھی ان دنوں لباس میں گہری دلچسپی تھی۔ میں ...سکتی تھی۔ ہر عورت کی طرح میرے دماغ میں بھی ایک خناس تھا۔ میں بھی سمجھتی تھی کہ مجھ جیسا شہر میں دوسرا ...

...میں نے چوڑی دار پاجامہ، گھیر والا شفون کا فراک، ٹاپ کرتا اور آب رواں جیسی تین گز کی اوڑھنی اوڑھی۔ رحمٰن فوٹوگرافر نہال ہو گیا۔ اسے سبجیکٹ کی تلاش تھی۔ کبھی ...میں کبھی فرنٹ کبھی بیک کبھی ہاف کبھی فل..... کڑک ...ت تصاویر بنا ڈالیں۔ اس ساری گہما گہمی میں خاں صاحب چپ چپ تھے۔ وہ نہ سویاں کھا رہے تھے نہ حسب ...میں چیش چیش تھے۔ میں نے موقع پا کر خاں صاحب سے پوچھا..... "کیوں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں..... بس ایسے ہی۔"

مجھے معلوم تھا کہ جب وہ 1۔ مزنگ روڈ کو یاد کرنے لگتے ہیں تو پھر انہیں ایسی ہی چپ لگ جاتی ہے۔

...کی طرح تعریف کی بھوکی عورت نے خاں صاحب سے پوچھا: "میرا فراک دیکھا آپ نے؟ بالکل ...ہے۔ صادق کہہ رہا تھا کہ اتنی باریک شفون سینا بہت ہی مشکل ہے۔"

صادق کی دکان سمن آباد مارکیٹ میں تھی اور وہ میرے کپڑے بڑی پریت سے سیتا تھا۔ بچوں کے یونیفارم بین ... بازار میں اسے Jolin تیار کرتا تھا۔ صادق سمن آباد چھوڑ کر چلا گیا تو پھر بھی اس کے ساتھ میرا رابطہ رہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" شفقو جی بولے۔

ان کی آواز میں رتی بھر گرم جوشی نہ تھی۔

"میں..... کیسی لگ رہی ہوں شفقو جی؟"

اب میں نے سیدھا وار.....

حملہ درست تھا، سیدھا جواب ملا۔ "سنو قدسیہ..... فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے..... جو بھی فیصلہ تم کرنا چاہو میں ساتھ ...اگر تم امراؤ جان ادا بننا چاہتی ہو تو تمہیں اختیار ہے۔ اگر تم مردانہ وار زندگی کی جدوجہد میں شامل ہو کر اپنا لوہا منوانا ...تم کو آزادی ہے کہ اپنی شناخت اپنی محنت سے حاصل کرو..... لیکن راستہ ایک ہی چننا۔ دو راستوں کا مسافر زیادہ ...نہیں کرتا۔"

"میں..... ذاتی شناخت.....؟ میں سمجھ نہیں سکی خاں صاحب۔"

"مرد عموماً اپنے اوصاف سے اور عورت اپنی ذات کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ اچھا ترکھان ریشمی کرتے نہ ...پہنے جانا جاتا ہے..... قابل ڈاکٹر سفید کوٹ میں ہی بھلا لگتا ہے۔ اسے رنگ برنگے لباس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جس ...کے رزلٹ اچھے نکلتے ہیں اس پر تعریف کے ڈونگرے برستے ہیں۔ اسے کسی کو impress کرنے کے لیے اپنی ذات ...نہیں پڑتی..... تم میں بھی بڑا پوٹینشل ہے۔ اس کی طرف توجہ دو تو تمہارے لیے شناخت کا دروازہ فوراً کھل جائے گا۔"

''میں سمجھی نہیں شفو..... بھلا مجھ میں کون سا پوٹینشل ہے۔ میں ناچنا گانا چاہتی تھی لیکن آپ کی روایات نے اُدھر بڑھنے نہیں دیا۔''

''چلیے ہم قصوروار سہی..... یا یوں سمجھیے ہم لوگ دقیانوسی مسلمان ہیں' لیکن تم میں ایک خوبی اور بھی ہے جس طرف سے تم لاپرواہی برتتی ہو۔ تم بہت اچھا لکھتی ہو۔ اگر پوری توجہ دو تو دور تک اور دیر تک لکھ سکو گی۔''

''لکھتی تو ہوں خاں جی..... میر شکاری کے قلمی نام سے کتنے مضمون لکھے ہیں۔ ادارت کرتی ہوں'' د... کی۔ جب کوئی افسانہ کم پڑ جاتا ہے تو جیدی کے نام سے گھوسٹ ڈیڈی کی طرف سے حتیٰ کہ صدیقہ کے لیے بھی ایک آدھ لکھ ڈالی ہے۔''

''لکھی ہیں کہانیاں قلمی ناموں سے..... لیکن..... لیکن.....'' وہ اٹک کھجانے لگے۔

''لیکن کیا.....؟ آپ گھبرائیں ناں..... لیکن کیا؟''

''ہر عورت کی طرح تم بھی عورت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو۔ عورت کی بدنصیبی کہہ لو وہ اپنی ذات کے ... زندہ رہنا چاہتی ہے۔ کم بخت اتنی ناقص العقل ہے کہ نہیں جانتی بڑھاپا اس کے اندر پل رہا ہے۔ جسم بھدا ہو جا... دانت جواب دے جاتے ہیں..... بال جھڑ کر بن کر رہ جاتے ہیں اور کوئی تعریف نہیں کرتا۔ پھر فیصلے بدلنے کا و... نہیں ہوتا۔ لے دے کے بچوں کے سہارے جینا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس کی توجہ جھٹک کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ ... آیا.....؟ فیصلہ کر لو..... جوں جوں وقت گزرے گا..... تمہاری شناخت بڑھے گی..... جوں جوں کام میں پختگی آئے گی دور دور پھیلے گی..... لیکن فیصلہ تم کو خود کرنا ہوگا۔''

''جی فیصلہ تو میں کر چکی ہوں خاں صاحب..... میں دونوں کام کروں گی..... عورت پن بھی برقرار ... گی..... اور..... ادبی شناخت بھی پیدا کروں گی۔''

''دیکھیے عورتوں کے لیے مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناول ''امراؤ جان ادا'' میں مشعلِ ہدایت ... ہے..... امراؤ جان ناچنے گانے والی بھی بنی رہی اور مشاعروں میں بھی آداب عرض کر کے شعروں پر ... رہی..... پھر اس کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ انجام کار جو بھی قسمت میں لکھا ہو تمہیں مل جائے گا لیکن فیصلہ د... چاہیے۔''

میں نے فیصلہ کیا لیکن خاں صاحب کو زبانی نہیں بتایا۔ میں جانتی تھی کہ عورت تو ویسے ہی مرد کی طرح ... میں بٹی ہوئی ہے۔ بچے' گھر' رشتہ داریاں' سوشل لائف' بازار' ان گنت بکھیڑوں میں سے جس قدر کم ہو جائے ا... آسان ہوگا۔

میں نے اپنا زیور لاکر میں بند کرا دیا۔ شادی کے لباس پیک کر کے دھر دیے اور سادہ لباس سلوا کر ... قمیص دوپٹہ اختیار کر لیا..... ایک بار اس کے بعد بھی مجھے ایک فیصلہ کرنا پڑا۔

صدیقہ کے بھائی کی شادی تھی۔

صدیقہ چودھری برکت علی کی کوٹھی میں بڑے اہتمام سے شادی کے انتظامات میں مصروف تھی۔ میں

سب بھی تیار ہو کر بروقت روانہ ہوئے۔ میں نے بناری ساڑھی، ہیل والی جوتی اور خوب میک اپ کر رکھا تھا۔ یہ لباس نہیں تھا اور غالباً خاں صاحب ایسی خاتون کے شانہ بشانہ چلنا نہیں چاہتے تھے۔

میں اپنے بھانویں خوبصورتی کا ماڈل بنی چلی جا رہی تھی۔

لیکن جب ہم گراؤنڈ کے دائیں راستے پر ٹیوب ویل کے پاس پہنچے تو خاں صاحب چلتے چلتے اچانک رُک گئے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا..... ''خیر ہے شقو جی طبیعت ٹھیک ہے؟''

وہ چند لمحے چپ رہے۔ غالباً سوچ رہے تھے کہ دل آزاری کیے بغیر کیسے سچ بولا جائے۔

''ہوا کیا ہے؟''

''بات یہ ہے قدسیہ کہ..... کہ..... دیکھو تم اپنا لباس تبدیل کر سکتی ہو؟''

''لباس..... کیوں اس میں کیا خرابی ہے۔ ہم شادی پر جا رہے ہیں۔ ایسی قیمتی ساڑھیاں ایسے موقعوں پر ہی پہنی جاتی ہیں۔''

''آپ حکم دیں آپ چاہتے کیا ہیں۔''

''حکم نہیں قدسیہ..... تم فیصلہ کرو..... ہمارے گھر میں ساڑھی کا رواج نہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میں..... ویسے ہی معتوب ہوں اور.....''

میں نے جرح کی، کیونکہ میں ساڑھی اتارنا نہ چاہتی تھی۔ ''خاں صاحب..... مشرقی پاکستان کا یہی لباس ہے۔ آپ کو تو ساڑھی پر فخر کرنا چاہیے۔''

''ہاں کرنا تو چاہیے لیکن ہمارے گھر والوں میں ابھی وسعت نظر نہیں ہے..... وہ کنویں کے مینڈک ہیں۔ جب سب پاکستانی بن جائیں گے تو شاید.....''

وہ چپ ہو گئے۔ ان کے لیے مجھے یہ کہنا بھی کافی بوجھل ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا اور سادہ شلوار قمیض پہن کر جب پھر باہر نکلی تو خاں صاحب مسکرا رہے تھے۔

مجھے میری والدہ نے بہت خوبصورت بناری کشمیری کڑھائی والی، تلے کے کام سے آراستہ قریباً پچاس ساڑھیاں دی تھیں۔ میں نے ان ساڑھیوں کو احتیاط سے پیک کر کے رکھ چھوڑا۔ اب میرا ارادہ پھر کبھی ساڑھی پہننے کا نہ تھا یا یوں سمجھیے میں نے یہ ہندوانہ لباس ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔

اشفاق احمد چاہتے تھے کہ میرے تمام عیوب، کمزوریاں، غفلتیں، Shortcomings لوگوں کی نظروں سے چھپی رہیں اور میری خوبیوں کو ہیرے کی طرح تراش کر مجھے معاشرے میں پیش کیا جائے۔ اس معاملے میں وہ اللہ کی طرح پردہ پوشی کرنے کو مدد کی بہترین صورت تصور کرتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اپنی کسی غلطی کا تمسخر اڑاتے نہیں دیکھا۔

لوگوں کے سامنے میری غلطیوں کو اس طرح پیش کرنا کہ سب کے لیے ہنسی مذاق نکل آئے، یہ حرکت ان کے نزدیک بڑی مذموم تھی۔ بار بار کسی نقص کا اعادہ کرتے رہنا ان کے مسلک میں ممنوع تھا۔ وہ تنہائی میں بھی انگلی اٹھا کر

مسکان دکھا دکھا کر آواز اونچی کرکے اپنے آپ کو منبر پر چڑھا کر مجھ سے بات نہ کرتے تھے۔ جب بھی علیحدگی میں بات کی آواز مدھم، لہجہ شیریں اور مفہوم مثبت نکالنے کی کوشش کی۔ ہم میں جو ساری عمر لڑائی جھگڑا نہ ہوا تو اس کی بنیادی وجہ خاں صاحب تھے۔ میں تو شاید کسی وقت بھڑک اٹھتی۔ تقریری مقابلہ جاری کر دیتی لیکن وہ شاید اچھی طرح جانتے تھے کہ تیر کا زخم تو مندمل ہو جاتا ہے لیکن زبان کا عطا کردہ زخم ایسا بیہودہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی ٹانکا نہیں لگ سکتا نہ یہ کبھی پورے طور پر مندمل ہوتا ہے۔

آپ سے پہلے عرض کر چکی ہوں کہ جونہی امیری، فارغ البالی، بھلے دن گھر کا رستہ دیکھ لیتے ہیں، کئی تبدیلیاں اچانک گھر کے دروازے پر دستک دینے لگتی ہیں۔ غریبی میں کھوما وقت تھم جاتا ہے۔ مصیبتوں کی شکل تو نہیں بدلتی۔ صبح شام وہی "رنڈی رونے" گلے پڑے رہتے ہیں، جس کے باعث غریب آدمی ڈیپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ امیری میں حالات بدل جاتے ہیں۔ تبدیلی بہت حد تک Opportunity کی شکل میں آتی رہتی ہے۔ آدمی کو جلد جلد فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ گڑبڑا کر غلط راہوں کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس طرح شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی کئی بار ڈیپریشن کی صورت میں نکلتا ہے۔

ہم بھی 79-1974 میں کئی تبدیلیوں کا شکار ہوئے۔ اچانک ایک دن بیٹھے بٹھائے ہی مجھے لاہور کالج فور ویمن سے نوکری کی آفر ملی۔ میں نے کسی جگہ نوکری کی درخواست نہیں دی تھی لیکن ان دنوں ٹیچنگ سٹاف کی قلت ہر کالج میں تھی۔ لاہور کالج میں بھی اردو ڈیپارٹمنٹ نیا نیا کھلا تھا۔ ظاہر ہے اس آفر نے میری اترابہٹ میں بڑا اضافہ کیا۔ رات جب بچے سو گئے اور گھر میں فراغت کا احساس ہوا تو میں نے وہ کاغذ نکالا اور خاں صاحب کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"یہ دیکھیے۔"

"کیا ہے؟"

"بس آپ دیکھ لیں۔"

شتو جی نے کاغذ اٹھایا۔ عینک درستی سے لگائی۔ چند لمحے پڑھنے کے بعد بولے: "مبارک ہو..... یہ تو بڑا اعزاز ہے۔ ہمیں تو نوکریوں کے لیے خاک چھاننی پڑتی ہے۔ تمہیں گھر بیٹھے بٹھائے آفر مل گئی۔ شاباش....." پھر وہ بڑی نرمی سے تہہ کرنے لگے۔

"تو پھر جوائن کر لوں..... کیا خیال ہے آپ کا؟"

وہ چند لمحے چپ رہے۔ پھر بولے..... "دیکھ لو سوچ لو۔ فیصلہ تمہارا ہونا چاہیے۔ میرے خیال کی ضرورت نہیں ہے۔"

بچوں پر ملازموں پر رعب ڈالتے مجھ میں ایک خاص قسم کا استانی پن پیدا ہو گیا تھا۔ نانا نے ایک بار بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ "قدسیہ! بچپن میں تو تیری طبیعت بڑی نرم تھی۔ اب تجھ میں مشنری میموں جیسی ڈسپلن پیدا ہو رہی ہے۔ نہ وہ خود آرام کرتی ہیں نہ کسی اور کو زندہ رہنے کا حق بخوشی دیا کرتی ہیں۔" مجھے پتہ نہیں کیوں اس روز بار بار نانا کا یہ جملہ یاد آ رہا تھا۔

"لیکن آپ مجھے کچھ تو فیصلہ کرنے میں مدد کیجیے ناں..... چلیے رائے ہی دیجیے۔"

"ہاں..... مولانا اشرف علی تھانوی سے اگر کوئی رائے مانگتا تو وہ کہتے..... بھائی کر وہ جو تمہارا دل چاہے۔ ہاں اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو یوں کرتا۔"

"ہاں تو بتایئے ناں کہ آپ کیا کرتے؟"

انہوں نے سر کھجایا اور سوال کیا۔ "تنخواہ قریباً کتنی ہوگی؟"

میں نے لجاجت سے جواب دیا۔ "غالباً ڈھائی سو روپیہ یا پونے تین سو۔"

"اچھا تو پھر حساب لگاتے ہیں۔ تمہیں روز تانگے پر کالج جانا پڑے گا۔ سالم تانگہ 75 روپے ماہوار سے کیا کم ہوگا۔ نوکی خاں ابھی چھوٹا ہے اس کی دیکھ ریکھ کے لیے کوئی مائی رکھنا پڑے گی۔ وہ بھی پچاس ساٹھ سے کم میں نہ ملے گی۔ پھر تم پرانے کپڑوں میں گزارا کر لیتی ہو لیکن کالج میں تو ایسے کپڑے نہیں چلیں گے اور ہاں پھر کیا پتہ شام کو فنکشن ہوں۔ تمہیں شام کو بھی کالج جانا پڑے۔"

"نانا کو مجبور کروں گی وہ گھر پر رہیں گی۔"

"بھلا وہ کب مستقل طور پر یہاں رہ سکیں گی۔"

میں چپ ہوگئی۔ میرے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔

اس روز نوکی خاں بلاوجہ اتنا رویا کہ مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگئی۔

میں نے جب لاہور کالج فور ویمن کو انکار کر دیا تو خاں صاحب منہ سے کچھ نہ بولے لیکن ان کے رویے سے مجھے احساس ہوا کہ وہ بڑے مطمئن ہیں۔ جیسے کسی بڑے قلعے کا محاصرہ توڑ دیا ہو۔

یہ 121 - سی ماڈل ٹاؤن کا واقعہ چونکہ اسی ڈھب کا ہے' اس لیے یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ایک بار جب شہاب بھائی ہمارے پاس آئے تو انہوں نے کہا..... "قدسیہ! یہ تمہارے پاس ہی شاکر علی میوزیم بن رہا ہے ہمیں اس کے لیے ایک عدد ڈائریکٹر کی ضرورت ہے۔ اگر تم مان جاؤ تو یہ نوکری میں تمہیں بہ سہولت دلوا سکتا ہوں..... اچھی تنخواہ کے علاوہ موٹر بھی ملے گی۔ گھر کے کام کے لیے دو نوکر بھی آجائیں گے اور سفر کے دوران سرکاری ٹکٹ بھی مل جائے گی..... سوچ کر بتاؤ۔"

ایک بار پھر میرے دل میں انا کا گلاب کھلا۔ اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ میں نے خاں صاحب سے پوچھا..... "آپ نے سن لیا ناں شہاب بھائی جو کہہ رہے تھے۔"

"ہاں سن لیا۔"

"پھر کیا کہتے ہیں آپ؟"

"دیکھو قدسیہ! بات میرے کہنے سننے کی نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی سے جو فیصلہ کرو گی ہم سب کو منظور ہوگا۔ ظاہر ہے اس وقت ہمیں پیسے کی تنگی نہیں ہے جس کی وجہ سے تم کو نوکری کرنا پڑے۔ گاڑی گھر پر موجود ہے۔ پھر پرسنل گاڑی اور ڈرائیور تو اسے درکار ہوتی ہے جو شخص بڑا سوشل ہو اور جسے گھر پر وحشت ہوتی ہو..... رہ گیا خانساماں تو ہماری جیونی' رمضان

سلامت رہیں۔ گھر پہلے ہی خدمت گزاروں سے بھرا پڑا ہے اور دو آدمی تابعدار بنا کر کیا ملے گا۔"

بہت سارے مسائل بدل چکے تھے لیکن میری نوکری سے ان مسئلوں میں سے کوئی بھی نہ سنورتا تھا۔ یہ ضرور تھی کہ میری شناخت ایڑی کی گرگابی مل جاتی۔ انسان کے اندر بسنے والی اس کی انا کسی طور پر مطمئن نہیں ہوتی۔ دم بھوکی پیاسی اور روکھی سی کچھ نہ کچھ مانگتی رہتی ہے۔ برسوں اس شیخی خورہ کو پانی دو.....اس کی پیاس ختم نہیں ہوتی۔ عمر کے آخری حصے میں جا کر کچھ کچھ پتہ چلا ہے کہ جس راستے پر اللہ کا ہاتھ یا ساتھ نہ ہو وہ راستہ صرف انا کا سفر ہے۔ یہاں کھانے کو تھوہر اور پینے کو گرم پانی ملتا ہے۔ آپ کو فرعون کی طاقت ملے یا قارون کا خزانہ نہ اپنا فائدہ نہ کسی اور کا.....

بس میں نے بڑی دقت سے اپنے لیے یہ بات سوچی کہ کسی اور کا فائدہ چونکہ نہ ہوگا اس لیے یہ کام افادے سے خالی ہے.....گھر بھر نے سکھ کا سانس لیا اور ایک بار پھر شانتی کی ہوائیں برآمدے میں چلنے لگیں۔

شہاب صاحب 121۔سی ماڈل ٹاؤن میں ہمارے بہت قریب آئے لیکن اس بارش کے ہلکے ہلکے چھینٹے آباد کے اسی گھر میں شروع ہوگئے تھے۔ یوں تو وہ خاں صاحب کے اس وقت کے جان کار تھے جب وہ 1۔مزنگ میں رہا کرتے تھے۔ پھر جب میری شادی ہوئی تو وہ اور عفت مجھے ہیلو ہیلو کہنے والوں میں شامل ہوگئے۔

لیکن شروعات اسی گھر سے ہوئیں۔

شہاب صاحب اس وقت وفاقی حکومت کے سیکرٹری تھے۔ محکمہ غالباً تعلیم کا تھا لیکن اب میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ سرکٹ ہاؤس میں رہا کرتے تھے' لیکن شام کو جب خاں صاحب گھر پر ہوتے وہ چھوٹے سے باورچی خانے میں تپائی نما میز پر بے جوڑ برتنوں میں گول ڈگڈگی موڑھے پر بیٹھ کر بڑے معمولی کھانے رغبت سے کھاتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دسترخوان پر مل بیٹھنے کی مہمان نوازی مسلمان ممالک میں چلی آرہی ہے۔ یہ روایت سب سے زیادہ ڈیروں پر نظر آتی ہے۔ یہاں فائیو سٹار کا کھانا نہیں ملتا نہ ڈچ کا رواج ہے کہ اپنا اپنا ادا کیا جائے۔ خاں صاحب کی تواضع بھی خاص الخاص دسترخوان سے وابستہ تھی۔ وہ چٹنی روٹی' اچار پراٹھا کھلانے میں کمی محسوس نہ کرتے۔ پر تکلف کھانوں کی ان کے نزدیک کوئی شرط نہ تھی۔ میں عموماً اہتمام کے بغیر کھانا کھلانے میں سبکی محسوس کرتی۔ میرا جی چاہتا کہ شہاب صاحب کے شایانِ شان کچھ ضرور ہو۔ خاں صاحب کہا کرتے: "قدسیہ! اہتمام نہ کرو انتظام کر لو۔"

میں ان دونوں کے فرق کو بہت بعد میں سمجھی۔ جب بھی شہاب صاحب آتے میں آلو کی پوریاں بنانے کی کوشش کرتی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس قسم کی پوریاں رغبت سے کھاتے ہیں۔ لیکن ان سے گفتگو بہت کم ہوتی تھی۔ میری طرف کبھی ان کی توجہ نہیں گئی۔ وہ خاں صاحب سے آگے ایک قدم نہ بڑھتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے اور بچوں سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کی.....کوشش تو غالباً وہ ایک ہی سمت میں کرتے تھے' لیکن ابھی مجھ پر ان کی یہ سمت نہ کھلی تھی۔ شاید خاں صاحب اس جہت کو جانتے ہوں لیکن انہوں نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا.....

ذکر تو خاں صاحب ویسے بھی بہت کم باتوں کا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہر معاملے میں اپنی رائے دینے

...ی دی تھی۔ جس وقت وہ طفیل نیازی کے ٹیپ لے کر گھر آئے۔ انہوں نے طفیل نیازی کا نام تک مجھے نہ ... طفیل نیازی کی گونج دار آواز سے بھر جاتا۔ ایک جادو سا فضا میں تیرنے لگتا۔

"میں مٹھیں جاناں کھیڑیاں دے نال" کی کوک بن کر کمروں میں تیرنے لگتی اور میں سوچتی رہتی پتہ نہیں یہ ... گانے والا کون ہے۔ پھر ایک دن ایک آدمی نانی اماں کے کمرے میں خاں صاحب کے پاس بیٹھا نظر آیا۔ ... ہے کہ جب کبھی بھی خاں صاحب کے پاس کوئی بیٹھا ہو میں از خود اس مجلس میں شرکت نہیں کرتی تھی اگر خاں ... بیٹھے تو اور بات تھی۔

"قدسیہ..... ذرا اِدھر آنا۔"

میں اندر گئی۔ ایک بھاری بدن ملائم سانولے چہرے اور کھرج دار آواز میں ایک شخص چینٹ قمیض میں ملبوس نانی ... ے میں بیٹھا تھا۔

"یہ طفیل نیازی ہے۔"

میرے چہرے پر شناخت نہ ابھری تو خاں صاحب بولے..... "بھئی جس کے گانے سن کر تم باورچی خانہ چھوڑ

"یہ میری بیوی ہے..... قدسیہ۔"

طفیل نیازی اپنی باتوں میں مگن رہا۔

طفیل سے بات کرنا مشکل نہ تھی کیونکہ اس کے پاس ان گنت باتوں کا پٹارہ تھا۔ کبھی وہ چراغاں کے میلے کا کوئی ... بھی مانگنے والوں کی ٹولی میں مل کر گانے بجانے کی کہانی سناتا۔ کبھی گھڑوی بجانے والیوں کا ذکر درمیان میں لے ... ملاقات میں اس نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔

"خاں صاحب! میں اور میرا چھوٹا بھائی فقیریا ہمارے ساتھ طبلچی سازندے فیصل آباد کی درگاہ سے چوکی بھر کر آ ... ہمیں بس نہ ملی۔ شہر سے دور ایک اجاڑ جگہ میں دریاں ڈال کر لیٹ گئے۔ خاں صاحب! کوئی آدھی رات گزری ... جنوں کی ایک ٹولی وہاں اتری۔"

"جنوں کی" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں بی بی جن ہوتے ہیں۔ ان کا ذکر اللہ کی کتاب میں آیا ہے۔ ٹھیک ہے آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپ ... پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی آنکھ دیکھ سکے، لیکن ہوا بھی تو موجود ہے ناں۔ آپ مانتی ہیں ناں۔"

"بی بی قدسیہ! میں نے بھی آپ کی طرح انہیں نہیں پہچانا تھا۔ لیکن فقیریا نے میرے کان میں کہا: "دیکھو بھائی ... ان میں سے کوئی بھی آنکھ نہیں جھپکتا..... یہ دوسری مخلوق ہے ہم میں سے نہیں۔"

"اچھا تو آگے چل۔" خاں صاحب بولے۔

"ہاں تو سرکار وہ ٹولی بھی اس رات اسی درگاہ پر چوکی بھرنے آئی تھی جہاں ہم چوکی بھر کر آئے تھے۔ فقیریا کی ... گئی لیکن میں پتہ نہیں کیوں سو نہ سکا بلکہ چوری چوری انہیں دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے سلطان باہو کا

کلام ایسی لہک سے گانا شروع کیا کہ وجد طاری ہوگیا۔ جی چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل میں جابسوں جہاں سوائے کوئی اور رشتہ باقی نہ رہے..... لیکن سرکار ہم لوگ..... ہم جوگانے بجانے والے' قوالی کرنے والے' مُرتے لوگ ہوتے ہیں' ہمیں اپنے رشتے بہت پیارے ہوتے ہیں۔ ہم لاکھ چاہیں' اپنے گھر والوں کے سوائے کسی کے نہیں ہوتے..... میرا ارادہ میرے سوئے ہوئے بھائی' گھر بیٹھی بیوی اور بچوں نے توڑ دیا۔ کچھ اونگھتا سوتا میں اُس غافل نہیں تھا۔ پھر وہ فجر سے پہلے اٹھے۔ اپنے ساز سنبھالے اور چلنے لگے۔ ابھی دس بارہ قدم دور ہوگئے جو سارے غائب..... باجا سارنگی ڈھولک طبلہ..... سمیت نہ کوئی نشان نہ کوئی اتہ پتہ نہ کوئی یادگیری نہ کوئی نشانی..... یہ واقعہ ہے سرکار..... لوگ تو میلوں پر اور بھی عجیب و غریب باتیں بتاتے ہیں.....''

طفیل اپنی مٹھلونی باتوں سے خاں صاحب کو رجھا رہا تھا۔ میں اس کی باتوں سے متاثر ضرور ہوئی ایمان لانا میری تعلیم کی وجہ سے ناممکن تھا۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ انسان کا ماحول اس کی ذات کو گھڑنے معاون ثابت ہوتا ہے۔ انسان کی تعلیم' ماحول' اس کی جبلت اور میل جول ایسے فیکٹرز ہیں جو ہر شخص کو ایک خا ڈالتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے اس قدر مماثلت بھی رکھتا ہے اور بیّن فرق کا دیتا ہے۔

لیکن موسم ان سب سے زیادہ انسان کی بناوٹ کو بدلنے میں مدد دیتا ہے۔ جن ملکوں میں برف باری شدید سردی معمول ہے وہاں لوگ گھروں میں محبوس ہوکر Introvert ہو جاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور ہوتے انسان کی اصلیت کا بغور مطالعہ کرنے کا وقت بھی ملتا ہے اور کرب بھی۔ اسی تنہائی نے یورپ میں سائنس کو دھیرے دھیرے انسان کو بھی سائنس کا حصہ بنا دیا۔

اس سلسلے میں بیسویں صدی میں یونگ' ایڈلر اور فرائیڈ نے نفسیات کی دنیا میں ایک انقلاب کی شکل لیکن انسانی مجبوری ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں محبوس ہوکر رہ جاتا ہے۔

فرائیڈ کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی تخلیقی قوت جنس تھی۔ جب اس کی آسودگی ممکن نہیں ہوتی تو میں اس تشنگی کا علاج ڈھونڈ نکالتی ہے۔ فرائیڈ نے اپنی تھیوری کو تقویت دینے کے لیے بہت سارے راستے ڈھونڈ یہ Psycho-analytical طریقہ علاج تھا۔ خوابوں کی تعبیر اور ان میں Symbols کی تلاش ایڈیپس کمپلیکس وہی اور نیوراسس اور شیزوفرینیا کے علاج کی سائنسی توجیہات نکالیں۔ کچھ عرصہ یونگ اپنے استاد فرائیڈ کے شامل رہا اور اس کے اندازِ فکر سے مطابقت میں آمنا و صدقنا کہتا رہا۔ یہ تعلق تو قائم رہا لیکن انسان کے متعلق تشریحات بھی خاطر خواہ اضافے ہوتے رہے۔

لیکن پھر یونگ نے انسان اور اس کی دیومالائی بیک گراؤنڈ کی طرف ایک اور نقطۂ نظر سے شدید توجہ کر دی۔ وہ سمجھنے لگا کہ فقط جنس ہی انسان کی واحد ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ماضی کا بھی حصہ ہے اور ان دیکھی طاقتوں اور اس طرح Cosmic Consciousness کی ایجاد ہوئی۔ یونگ نے Introvert-Extrovert میں انسان کیا اور ماورائی تجربات کو بھی زندگی کا ضروری حصہ بنا دیا۔ حضرتِ انسان کی تلاش نے ایڈلر کی سمت بھی متعین کر دی

نطشے: وہ اس بات کو اہمیت دیتا تھا کہ انسان میں Will to power اہم ہے۔ ہر انسان رب بننے کی کوششوں میں رہتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی قوت اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی خواہش میں پنہاں ہے۔

فرائیڈ کی جنس سے وابستگی۔

یونگ کا Archetypes سے عشق اور ماورائی قوتوں کی رغبت۔

نطشے کا Will to power کا فلسفہ۔

یہ تینوں اپنی اپنی سمت کے بڑے کام تھے' لیکن یہ سارا سچ نہیں تھا۔ میرا علم اتنا نہیں کہ میں ان تینوں پر آپ سے بحثیں پیش کر سکوں۔ لیکن مجھ پر خاں صاحب کی صحبت میں ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ انسان چاہے جو حاصل کرے اس کی تلاش کی معراج مذہب ہے۔ یہاں آپ کو منوانے سے بھی زیادہ کسی کو ماننے کی ضرورت رہتی ہے۔

انسان چاہے کسی مقام پر پہنچ جائے' تشنہ لب رہے گا۔ قارون کے خزانہ' فرعون کی طاقت میں اللہ کا ہاتھ اور اس کی رضا بے کار ہے۔ انسان کے اطمینانِ قلب' صبر و شکر' ترقی و فلاح کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک در ایسا بھی تلاش کرے جہاں اندھا اعتقاد و ایمان اُسے ماتھا ٹیکنے پر ہمیشہ رضا مند رکھے۔

خاں صاحب سمجھتے تھے کہ یہ تلاش جو انسان کا مقدر ہے' سب سے زیادہ فنکاروں کا نصیب ہے۔ وہ شاید خدا کو تو نہ پاتے لیکن اپنے میں وہ جوہر ڈھونڈ لیتے ہیں جو ان کی شخصیت کا بہترین اظہارِ تشکر ہوتا ہے۔

جو لوگ طفیل نیازی کی طرح رب رب کرنے والے فنکار ہوں وہ اپنی جملہ خرابیوں کے باوجود (خرابیاں تو ہم سب میں ہیں) شاکر اور صابر آدمی طفیل نیازی کی اونچ نیچ' مشکلات' اوگھٹ گھاٹیاں' زندگی میں بھی عام نارمل آدمی کی طرح آتی ہیں لیکن وہ کبھی اللہ کا شکوہ نہیں کرتا تھا۔

لیکن مجھ میں نہ تو خاں صاحب والی تلاش تھی۔

نہ طفیل نیازی جیسی تسلیم و رضا۔

مجھے میری تعلیم نے صرف یہ سکھایا تھا کہ اپنے زورِ بازو پر اعتماد کرو۔ جو لوگ اپنی توانائی اور تقویت کو بروئے کار نہیں لاتے ان کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ مجھے نہ کسی مقدر پر یقین تھا نہ کسی قوت پر اندھا یقین ہی تھا جو انسان کو سرنگوں ہو جانے کی توفیق دیتی ہے۔ میں تو کسی خودسر بچے کی طرح اپنے سینہ پر مکا مار کر کہنے کی عادت تھی۔

”میں میں آپے آپ۔ میں خود۔“

اسی جذبے کے تحت ایک روز جب طفیل نیازی ہمارے گھر آئے تو میں نے ان سے کہا۔ ”طفیل بھائی! مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ میں ایک ماسٹر صاحب سے کچھ دیر کلاسیکی موسیقی بھی سیکھ چکی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے گانا سکھا دیں..... میں اس فیلڈ میں نام پیدا کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ از راہِ ادب چند ثانئے چپ رہے۔ پھر ہولے سے بولے۔ ”ہاں بی بی! ذرا میرے ساتھ سرگم اٹھائیں۔“

ایک بار طفیل بھائی نے سا رے گا ما کی سرگم بڑی سادگی سے ادا کی۔ توقف کیا پھر سرگم دہرائی اور چپ ہو گئے۔

میں نے ان کے تعاقب میں گویا سُر سُر ٹھیک ہی گایا۔

پھر انہوں نے دو تین بول ایک ٹھمری کے گائے۔ میں نے نقل بہ نقل اصل اتاری۔ جہاں تک نقل کا تعلق درست تھی لیکن ان کے بھاؤ میں کچھ کسر تھی۔ وہ چپ ہو گئے۔ میرے گانے کی کوئی تعریف و توصیف نہ کی۔ میں ہوئی لیکن خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد بولے۔ ''میں بی بی ہر ایک سے جھوٹا بولتا ہوں لیکن شاگرد سے ایسی دل لگی ہوں۔ تمہارے علم میں کوئی کمی نہیں..... لیکن تمہیں میرے رب نے وہ آواز نہیں دی جو اصلی گائیک کو ملتی ہے۔ رہیں تو درمیانے درجے کا اثر تو پیدا کر لیں گی لیکن وہ بلندی بس میں نہیں آ سکتی جو اچھی آواز کو ملتی ہے..... آپ جب جاتی ہیں تو آواز کانپنے لگتی ہے..... یہ بڑا نقص ہے۔''

میری شکل دیکھ کر طفیل بھائی کو ترس آ گیا..... ''آپ کسی اور فیلڈ میں کام کریں۔ کیا پتہ وہ شہرت مل جائے آپ کو شوق ہے۔''

اس سے پہلے میں شوقیہ کمروں میں غسلخانے میں، باورچی خانے میں گایا کرتی تھی لیکن اس کے بعد یہ بند ہو گیا۔ خاں صاحب نے بھی ایک دو مرتبہ مجھ سے کہا: ''ہاں یار آواز تمہاری تو کانپتی ہے.....'' میری والدہ بھائی اور میں پہاڑوں سے گاتے چلے آئے تھے۔ لیکن طفیل نیازی کی بات نے مجھے محتاط کر دیا۔

انسان کے ہر اچھے سے اچھے عمل کا راستہ برے عمل کی طرف نکل سکتا ہے اور اس کی بدی کا دروازہ ایک نیکی کی راہ پر کھل سکتا ہے۔ میری اس دلآزاری سے میرے لیے ایک بہت ہی اچھا تجربہ میری زندگی میں شامل ہو نے قلم اور کاغذ تھام لیا اور اپنی دلچسپی کی سمت بدل ڈالی۔

اگر میں کانپتی آواز میں تانیں اٹھانے والی ٹھمریاں گانے والی ہوتی تو شاید ہوشیار پور کے پٹھان اندر بھاگ جاتے اور میں منیر نیازی کو کبھی نہ جان سکتی۔ لیکن پتہ نہیں میری تقدیر کتنی یاور اور میری عقل کتنی کوتاہ ہے کہ مجھے قابل ذکر لوگوں کی توجہ ملی۔

منیر نیازی ہمارے گھر آیا کرتے تھے لیکن مجھ سے کبھی لمبی چوڑی بات نہ کی تھی۔ ایک روز آئے تو خاں صاحب گھر نہ تھے۔

''تم ہیے..... جانتی ہو میں کون ہوں؟''

''جی جانتی ہوں۔ میں نے آپ کی دو تین غزلیں اور نظمیں ''داستان گو'' میں چھاپی ہیں۔''

ہر ایڈیٹر کی طرح ''داستان گو'' کا ذکر کر کے میں نے اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔

''او میری بڑی مشکل آسان ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اشفاق رسالہ نکالتا ہے۔ اب پتہ چلا واقعی اس رسالے سے تیرا بھی کچھ تعلق ہے۔ ہاں بھئی اشفاق گھر پر نہیں ہے۔ میں نے اپنی پنجابی نظموں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ اگر تمہارے ادارے کا ارادہ ہو تو چھاپ لو.....''

''نام کیا رکھا ہے منیر بھائی؟''

''سفر دی رات.....''

منیر نیازی نے چپکے سے نظمیں پکڑائیں۔ مجھ سے کوئی لمبی چوڑی بات نہ کی اور جلدی رخصت ہو گئے لیکن پتہ چل گیا کہ انہیں مجھ پر مکمل اعتماد ہو گیا۔ یہی اعتبار اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے اپنی نظموں کا انگریزی مجموعہ منسوب میرے نام کیا۔ ان کے لیے غالباً یہ ایک معمولی بات تھی لیکن میرے لیے یہ اعزاز کسی تمغہ حسن سے کم نہیں۔

منیر نیازی بھی پٹھان برادری کے جملہ مردوں کی طرح اظہار کے معاملے میں بڑے جھینپو تھے۔ خاں صاحب نہیں رشتہ دار بھی تھے کہ نہیں، لیکن دونوں ہوشیار پور کے عاشق تھے جہاں ان کے پرکھوں نے پڑاؤ ڈال کر سکھ کا سانس لیا۔

شوالک کی پہاڑیوں سے دونوں کو گہری محبت تھی۔ دونوں کے دلوں میں بچھڑی ہوئی گلیاں، بے آباد گھر، مٹی اڑاتے راستے، اجڑی بجڑی قبریں، گرے پڑے کتبے اور یادوں کی سنسناتی ہوائیں چلتی ہول، ان کے اندر امید بن کر تو طلوع ہوئی لیکن یہ امید جیسے ہوا کی زد میں رکھا ہوا دیا تھا کہ نہ بجھتا تھا نہ طرح لو دیتا تھا۔

منیر نیازی کے خوبصورت چہرے کو میں نے کبھی کھلکھلاہٹ میں نہیں دیکھا۔ وہ چہرہ ہمیشہ تھوڑا تھوڑا ہنستا ہوئے اپنی مسرتوں کو بھی چھپائے رکھتا گویا نظر بد سے بچا رہا ہو۔ سب سے بھلی چیز منیر نیازی کی آواز تھی..... کچھ بیٹھی بیٹھی سی آواز..... کچھ کسی محبوبہ کے آگے عرضِ حال کرتے وقت رکی رکی سی، کچھ حاکم وقت سے مراعات مانگنے کی شرمندگی اور اصرار سے بوجھل آواز.....

منیر نیازی کے مالی حالات کبھی درست نہ رہے۔ وہ ان مالی حالات کے ہاتھوں بڑے زچ ہوا کرتے تھے۔ دراز کرنے کی جسارت دل سے بری لگتی تھی اور ساتھ ہی مانگے بغیر چارہ نہ تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ آخر تک دروں پر جانے کی حاجت رہی۔

دبئی، امریکہ، لندن میں ہونے والے مشاعروں میں جانے کے لیے پہلے دعوت کا انتظار کیا کرتے پھر خود ہی کوشش بھی کرتے اور شرمندہ بھی ہوتے۔ ہمارے ہاں عجیب بات ہے کہ مشاعروں میں شاعروں کو اکٹھا کرنے والے ایسے شاعروں کا ہجوم رہتا ہے جو ہر طرح سے ان کی خوشامد کر کے اپنا راستہ بناتے ہیں۔ خوشامد چونکہ ان کو مرغوب ہے اس لیے نو دولتیوں کی طرح ان نوشاعروں کی کھیپ سے مشاعروں کا بندوبست کرنے والوں کو بڑی سہولت رہتی ہے۔

ان حالات میں منیر بھائی کو بھی خوشامدی رعایا میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ان دنوں مشاعروں کا چکر نہ چلا تھا۔ منیر نیازی ابھی ساہیوال میں رہتے تھے۔ جب بھی لاہور میں قیام ہوتا وہ ہمارے گھر ضرور آتے۔ ایسے ہی ایک دن وہ اپنی بیوی کو لے کر ہمارے پاس آ گئے۔

"یہ میری بیوی ہے قدسیہ..... تم سے ملنے کا اسے بہت شوق تھا....."

میرے سامنے جوان سال خوبصورت منیر نیازی کے ساتھ ایک جوانی ٹپی، مرجھائی سی میلی میلی خاتون کھڑی تھی،

جس کے چہرے پر لجاجت آمیز مسکراہٹ معافی کے انداز میں پھیلی تھی۔ میں نے دل میں اس بے جوڑ شادی پر
لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ خاں صاحب نے بھی تو خاندان سے باہر شادی کی تھی اور میں کسی طور پر ان کا مقابلہ نہ کر
پھر سجاد تھا..... اشتیاق تھا..... خالد آفتاب تھا..... جاوید طارق تھا۔

ان روایت توڑ پٹھان بچوں نے خاندان سے باہر شادی کر کے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی تھی کہ
کے مرد گھر سے باہر جب بھی چناؤ کرتے تھے ہمیشہ برا مال خرید کر اسے سر کا تاج بنا لیتے تھے اس لیے نہیں کہ
بے مایگی کا علم نہیں تھا بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ انہیں اپنی Commitment کا ہمیشہ پاس رہتا۔ وہ کسی غلط
فیصلہ کر بیٹھنے سے اس سزا کے سزاوار بن جاتے۔

منیر نیازی اپنے سے عمر میں بڑی خاتون کے ساتھ بڑی محبت سے دن گزارتے گزارتے بالآخر
پہنچے جب ان کی بیگم داغِ مفارقت دے گئیں اور وہ ایک بار پھر تنہا رہ گئے۔

منیر نیازی بھی آتے رہے اور طفیل نیازی بھی۔ ایک روز جمیلہ اختر اس وقت آئیں جب طفیل بھائی
تھے۔

جمیلہ دراز قد خوبصورت اور مروت والی روح تھی۔ شہر کے ایک معتبر رئیس میر صاحب کی بیگم تھیں۔
دنیا سے رخصت ہو گئے تو جمیلہ کو تین بچے دے گئے۔ ایک بیٹی امریکہ میں بیاہی گئی ہے اور دو بیٹے اچھے مقامات
جمیلہ کے لیے باعث فخر ہیں۔

ان دنوں جمیلہ کے پاس اس کی آواز قہقہے کا ویزا تھا۔ وہ بڑی خوبصورتی سے ڈائیلاگ ادا کرتی
اس کا قہقہہ باعث شہرت تھا۔ اسی قہقہے کی بدولت وہ طفیل نیازی سے متعارف ہوئی۔

جب سُر کے رسیا نے جمیلہ کی ہنسی سنی تو خاں صاحب سے پوچھا: ”یہ کون سُر میں ہنس رہی ہے؟“

خاں صاحب نے جمیلہ کو آواز دے کر بلایا۔ تعارف کرایا۔ ”یہ ہماری ڈرامہ وائس ہے۔ میرے ڈرامے
عموماً یہی مشرقی کردار ادا کرتی ہے۔“

طفیل نیازی نے بڑے اشتیاق سے کہا..... ”بی بی! میرے پیچھے پیچھے ذرا سرگم گاؤ۔“

جمیلہ اختر نے بڑی سہولت سے خوفزدہ ہوئے بغیر سرگم کا تعاقب کیا۔

پھر کسی ٹھمری کا مکھڑا گایا۔ یہ بھی جمیلہ کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ لوک گیت کے اونچے سروں میں طفیل
کمرے میں گونج پیدا کر دی۔ جمیلہ اختر نے اس گونج کی بازگشت سنا دی۔ بڑے امتحان میں پاس ہونے کے بعد
پروا تھی۔ ایک بڑے فنکار کی طرح اسے کام کر چکنے کے بعد بھی گھبراہٹ کا احساس نہ ہوا تھا۔

”لو بی بی اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنا شاگرد بنا سکتا ہوں۔“

مجھ پر حسد کا بم گولا گرا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جمیلہ جو میری چھوٹی سی اور خاں صاحب کی بڑی
یوں اس کی پذیرائی ہوگی۔ پرستار عموماً قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ طفیل بھائی جمیلہ
استاد ہیں اور اس کے گھر جا کر اس کی تعلیم فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی طفیل بھائی کا ذکر اس سے نہ کیا۔

مجھے ...میں حسد کی یلغار کے بعد اس کے تعاقب کا وقت بھی نہ ملا۔ جمیلہ ہمارے گھر چھوٹی بہنوں کی طرح آنے ... آباد ہی میں رہتی تھی۔ پھر وہ ایک دن اپنے ساتھ صابرہ سلطانہ اور اس کی بیوی روحی کو لے کر آ گئیں۔ یہ ... تھیں جنھوں نے ''اُچے برج لہور دے'' میں جمیل بسمل کے ساتھ سیکو جی کا معرکتہ الآ را رول کیا تھا۔ صابرہ خوش لباس اور اپنا آپ نہ منوانے والی خاتون تھیں۔ وہ بہت کم شلوار قمیض پہنتی تھیں۔ عموماً ہلکے پھلکے رنگوں کی ... رتیں۔ جمیلہ اختر اور وہ چند بار اکٹھی آئیں۔

ہمیشہ کی طرح صابرہ اور روحی خاں صاحب کی زیادہ چہیتی بن گئیں اور جمیلہ دیکھتی رہ گئیں۔ یقیناً جمیلہ پر بھی پڑا ہوگا لیکن اس نے کبھی منہ سے اظہار نہ کیا اور ہولے ہولے پیچھے ہٹ گئی۔

...یہ خطرہ ہمیشہ دوستی میں رہتا ہے۔ جب کبھی کوئی شخص اپنا دوست اپنے کسی دوسرے دوست سے ملواتا ہے تو یہ ... ہے کہ جب تمہارے یہ دونوں دوست بہت قریب آ جاتے ہیں اور آپ کی نفی کر دی جاتی ہے۔ اس بات کو کیا کیا ... سہل پسند ہے۔ جب کوئی بنا بنایا رشتہ تھالی میں رکھ کر پیش کیا جاتا ہے جو قابلِ اعتماد بھی ہو تو پھر انسان اس ... پورا نہیں اتر سکتا اور غوطہ لگ جاتا ہے۔ ایسے ہی جمیلہ بھی ڈبکی لگا گئی۔

479۔ این میں جب یو ایس آئی ایس ریڈیو پاکستان گویا خاں صاحب کی عادت کا حصہ بن گیا۔ ایک اور ... اور گھر پر بڑے زور کی دستک دی۔ یہ دستک ناہید کی تھی۔ آپا فرخندہ کی بیٹی ناہید.....

میں شاید پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ اقلیت ہمیشہ مٹھی بند معاشرے میں اپنا تحفظ محسوس کرتی ہے۔ وہ اپنی ... رواج، لباس، اندازِ گفتگو، زبان کے پیچھے مر مٹنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اکثریت کے دریا میں اپنی ناؤ بہاؤ ... تے ہیں، پر چلو بھر پانی کشتی کے اندر آنے نہیں دیتے۔

...ان لوگوں کی تبدیلی جب بھی آتی ہے خاندان کے کسی فرد کی انفرادی سوچ کے ہاتھوں آ سکتی ہے۔ جب ... باہر شادی کرنے کا ارادہ کر کے خاں صاحب نے پُر سکون پانیوں میں تلاطم برپا کیا تو خود ان کے اپنے اندر ... خواہش نے احترام جرم، احساسِ کمتری اور حزن و ملال کے چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا کر دیئے۔

اس بار ناہید نے اس تبدیلی کا شوشا چھوڑا۔ اسے حسنِ اتفاق یا شومئی قسمت کے باعث قدسیہ سے محبت ہو گئی تھی ... ت میں ویسا ہی اعتماد تھا جیسا خاں صاحب نے مجھ پر کیا۔

...ں صاحب گھر پر نہیں تھے۔ بچے اور میں سمن آباد 479۔این کے بیرونی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کچھ دیر ... ین سائیکالوجسٹ کی بیوی کا چھا اپنے بچے کو پرام میں دھکیلتی لے گئی تھی۔ اس وقت ہمیشہ کی طرح حیا کی مورت ... بجھ سکنے والی ناہید کلفا اندر آئی۔ اس کے ساتھ بچوں کا ایک ٹرائی سائیکل تھا۔ اس نے نوکی کو سائیکل پکڑایا جو ... وہ بھاگ کر گلی کی طرف لے گیا۔ اثیر خاں میری گود میں سو رہا تھا۔ اس لیے وہ سائیکل Excitement میں شامل

''قدسیہ آپا۔''

''جی۔''

''قدسیہ آپا۔''

''ہاں کہو؟'' میں نے استادوں کی سی دھمکی کے ساتھ کہا۔

''قدسیہ آپا۔''

''بتاؤ ناں ناہید۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

''آپا جی جواد..... سجاد؟ کوئی؟'' اس نے دائیں بائیں کچھ ذومعنی سا سر ہلایا۔

''اچھا میں پرے دیکھتی ہوں۔ تم ہمت کر کے کہہ ڈالو۔''

''وہ جی آپ کو پتہ ہے ابو لیبیا گئے ہوئے ہیں۔ اب آپا کا بھی ارادہ ہے کہ وہ ابو جی کے پاس چلی جائیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ اس میں بسورنے کی کیا بات ہے؟ ہر بیوی کو شوہر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔''

''اتنا آسان نہیں قدسیہ آپا..... میں جہلم چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔''

جہلم کا نام سن کر مجھے یاد آیا کہ اب ناہید میری شاگرد نہیں تھی۔ ناہید کلفا آپا فرخندہ کی بڑی پرائم گلاس فیکٹری والوں کی بہو تھی۔ اس کے سسر سعید احمد خاں بڑے اصولوں کے آدمی تھے اور ان کے بھائی رشید احمد خاں جن کی ناہید بیوی تھی' جہلم سے گہری محبت رکھتے تھے' وہ بھلا ناہید کو کیونکر جہلم چھوڑنے کی اجازت دیتے۔

''لیکن جہلم چھوڑنے کی ضرورت کیا پیش آئی ناہید؟''

''وہ جی..... بات یہ ہے کہ جواد کے دسویں کے امتحان ہیں۔ بلال بھی ایک سال بعد دسویں میں ہو گا..... نبیلہ آپ جانتی ہیں' تھوڑی سی ایب نارمل ہے۔ اس کی ساس' دیور اور نبیلہ کا شوہر افضل خاں بھی 36۔ جی میں ہیں۔ نہ نبیلہ گھرداری کر سکتی ہے نہ بے بے جی..... پھر بتائیے آپا جی کس کے پاس 36۔ جی جائیں..... سجاد اور عمر تو خیر..... اپنے فیصلے کر سکتے ہیں لیکن جیونی رمضان اور یہ باقی سب ان سب کی ذمہ داری کون اٹھائے؟''

بچے ٹرائی سائیکل پر خوش گلی میں آ جا رہے تھے۔

''قدسیہ آپا جواب دیں ناں..... آپ 36۔ جی آ جائیں گی.....''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ناہید لیکن کیا خاں صاحب مان جائیں گے؟''

''بس ٹھیک ہے آپ مان گئیں تو وہ آپ ہی مان جائیں گے۔ اب میں خوشی سے جہلم جا سکتی ہوں۔''

اس نے جھینپتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

میں نے بھی گرم جوشی سے ہاتھ دبایا۔

''تم فکر نہ کرو ناہید..... آپا جی کو مزے سے جانے دو..... وہ برسوں بن باس سہہ چکی ہیں۔''

اس رات خاں صاحب یو ایس آئی ایس سے لوٹے تو تھکے ہوئے تھے۔ مارلاک اور انہوں نے وی او اے کے پروگرام کا زائچہ بنایا تھا۔ خواجہ سلیم بچوں کی طرح آنکھیں کھولے ساتھ ساتھ تھے۔

کھانے کے بعد ہم دونوں صحن سے ملحق برآمدے میں چارپائی پر سونے کے عادی تھے۔ بچے اندر والے کمرے میں سوتے تھے۔ رات گئے میں نے خاں صاحب کا کندھا ہلا کر کہا۔

"خان صاحب آپا جی لیبیا جارہی ہیں۔"

"کون سی آپا جی؟"

"آپا فرخندہ۔"

"اچھا تو جائیں۔ سو جاؤ اب۔"

"لیکن؟"

"لیکن کیا سو جاؤ؟"

"وہ ہم اگر..... یعنی اگر ہم 36۔ جی شفٹ کر جائیں تو پھر آپا بسی سے جا سکتی ہیں۔ ورنہ....."

"بھائی سو جاؤ آخر صبح بھی تو ہوگی ناں۔ تب یہ رندی رونا کر لینا۔"

"دیکھیں ناں خاں صاحب! جواد نے دسویں کا امتحان دینا ہے۔ بلال..... بھی پڑھ رہا ہے..... نبیلہ اس کی بے حس خاں اشرف..... اور پھر ان کے نمک خوار جیونی رمضان..... ان کو..... یہ سب کیا کریں گے۔"

"قدسیہ..... ہمارے اپنے بہت مسائل ہیں۔ میں کسی اور کے پھڈے میں کیسے ٹانگ پھنسا سکتا ہوں۔ قدسیہ یہ مرض ہے۔ تم ہمیشہ بغیر سوچے سمجھے Commitment کر لیتی ہو..... کیا تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ تفکر بھی ایک حج ہے۔ مثبت سوچ کا آدمی جب کوئی عمل کرتا ہے تو پھر اس کے فیصلے سے نہ کسی کو نقصان پہنچتا ہے نہ اس کا اپنا حرج

میں نے لجاجت سے سر جھکا لیا۔

مجھ میں ایک کمال کی کم عقلی موجود ہے جو ثابت کرتی ہے کہ میں "رج" کے ناقص العقل ہوں۔ مجھ میں ہر کام کو کرنے کا اس قدر شوق ولولہ اور Motivation بھڑک اٹھتی ہے کہ میں کبھی نہیں سوچتی کہ کام میرے بس کا نہیں۔ اسی جذبے کے تحت جب میری شادی ہوئی میں باورچی خانے میں گھس گئی۔ مجھے روٹی پکانا نہیں آتی تھی لیکن نہ میں نے سیکھنے کی زحمت کی نہ میری خود اعتمادی میں ہی کمی آئی۔ میں بغیر سوئمنگ سیکھے پانی میں کود جانے والی تھی۔

میں بھاکھو ڈیڈی کی خصوصی طور پر شکر گزار تھی۔ انہوں نے والدین کی مرضی کے خلاف میرا اور خاں صاحب کا نکاح پڑھوایا تھا۔ وہ کھانے پینے کے شوقین تھے۔ مجھے کہنے لگے۔

"کاکی! میرے لیے روٹی پکا..... سالن میرے ڈبے میں ہے۔"

میں باورچی خانے میں گئی۔ حسن اتفاق سے گندھا ہوا آٹا موجود تھا۔ میں نے بے ڈھنگی سی روٹی بیلی۔ قریب ہی گھی کے ڈبے کا بڑا ڈبہ پڑا تھا۔ اس کو روٹی پر گھمایا اور تھوڑا سا تھپ تھپ کر کے روٹی توے پر ڈال دی۔ حسن اتفاق سے کسی نیک روح نے مدد کی۔ روٹی پھول کر کپا ہوگئی۔ میں روٹی لے کر ساتھ والے کمرے میں بھاگی۔

ڈیڈی جی خوب خوش ہوئے..... "دیکھا شتو تو کہتا ہے یہ کھانا پکانا نہیں جانتی۔ میری منو سب کچھ جانتی ہے۔"

خاں صاحب نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا۔ حیرانی سے روٹی پر نظر ڈالی اور چپ ہو گئے۔ وہ میرے Image سے خوش ہوا کرتے تھے۔

صدیقہ بیگم کا بیاہ جب جاوید طارق خاں سے ہوا تو اس کی عمر بمشکل سولہ برس کی تھی۔ وہ بھی لاڈلی بیٹی تھی کام کاج سے فارغ رہی تھی لیکن ڈالڈا روٹی پریکٹس میں وہ بھی جلد روٹی پکانا سیکھ گئی۔ (میں نے سری پائے پکانے کیسے یہ بھی کبھی کھکھوویڈی کے حوالے سے بتاؤں گی۔)

جب میں نے بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری اٹھائی تو مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حروف تہجی کتنے ہیں۔ ڈی میں کون سے حرف Vowels کہلاتے ہیں' لیکن کمر بستہ ہو کر بچوں کو پڑھائی گئی اور بخدا اچھے خاصے مار دی۔ انہیں پڑھائی سے اس قدر نفرت ہوگئی کہ وہ کلاسیں چھوڑ کر بنچ پر باہر بیٹھنے لگے۔ کالج جاتے لیکن باہر اوور کر آ جاتے۔ اپنے بیٹوں کے تعلیمی مشاغل کی داستان میں پھر کبھی آپ کو سناؤں گی..... اب صرف یہ بتانا مقصود نے بغیر سوچے سمجھے 36۔ جی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ خاں صاحب نے ہمیشہ کی طرح میرے وعدے کا پاس کیا مکانی کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

خاں صاحب اس تبدیلی کے لیے ہرگز ہرگز نہ ذہنی طور پر نہ جسمانی اعتبار ہی سے تیار تھے۔ اس وقت آئی ایس میں چودھری تھے۔ انہیں سمن آباد ڈونگی گراونڈ اور 479۔ این سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔

جس روز ہم سب سمن آباد چھوڑ کر ماڈل ٹاون گئے۔ مجھے نئی ذمہ داریوں کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ صاحب فاروقی کی دکان' درزی جمیل کا درزی خانہ' جہاں سے بچوں کے یونیفارم بنواتے تھے، سبزی والے ٹھیلے سبزیوں سے لدے ٹوکرے' بچوں کا سکول' مین سڑک سے ملحق جوتوں کی دکان اور وہ راستہ جس سے وہ کئی برس موٹر سائیکل سے آتے جاتے رہے تھے اور پھر یہی راستہ جہاں انہوں نے قدرے خوشحال ہونے کے بعد موٹر سائیکل Lambretta خریدی تھی..... یہ راستے' دکانیں' ہم شکل گھر' ساری بستی کو دل میں بسائے 36۔ جی ماضی سے سبکدوش ہو کر نیا کورا صفحہ الٹنے کے عادی نہ تھے۔ ہر نئی تحریر کے ساتھ پرانی لکھت ساتھ چمٹی چلی آتی۔ صحبتیں پیچھے نہ رہ سکیں' اذیت دینے کے لیے ساتھ آ گئیں۔

آپا جی کے پاس جانے سے پہلے غیرت مند پٹھان بچے نے اپنی بڑی بہن سے یہ طے کر لیا کہ وہ انہیں دو سو روپیہ کرایہ دیتے رہیں گے۔ اسی قدر ماہانہ وہ سمن آباد کے گھر کے لیے دیتے تھے۔

سامان ریڑھوں پر روانہ ہو گیا۔ خاں صاحب کی لائبریری کا سب سے زیادہ فکر تھا۔ تین ریڑھے کتابوں اور رسالوں سے لدے تھے۔ محمد علی جو "داستان گو" سے ہمارے ساتھ تھا' ان ریڑھوں کی نگرانی کے لیے سائیکل پر تھا۔ نہیں کس موڑ پر اور کیسے ایک ریڑھے والا جس پر رسالے لدے تھے' محمد علی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور سیدھا کے سامنے ردی والوں کی جانے کس دکان پر سارے رسالے بیچ باچ کر چمپت ہو گیا۔

سامان کی نگرانی خاں صاحب اور ریاض محمود کر رہے تھے۔ ریاض محمود تب ریڈیو سٹیشن میں سکرپٹ ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور خاں صاحب کے ان چند عقیدت مندوں میں سے تھے جن کا رویہ ہمیشہ ایک سا رہا۔ وہ خاں صاحب

تھے لیکن پھر بن باس لینے والے جوگی کا دل لگانے شام کو راج گڑھ روڈ سے روز آتے۔ ایسی وفاداری بشرط
میں دیکھنے کو ملتی ہے' لیکن خاں صاحب میں کوئی عجیب سی گیدڑ سنگھی تھی۔ جو ایک بار اُن کے دام محبت
پھر وہ کبھی رہائی چاہتا نہ اسے رہائی ہی ملتی۔

صاحب سمن آباد چھوڑنا نہ چاہتے تھے' انہیں اس کی سڑکوں سے' مین بازار سے' بانڈرادری' سکول کی گراؤنڈ'
سے ایک خاص قسم کی انسیت پیدا ہو چکی تھی۔ اسی گھر میں پہلی بار انہیں Norelco کا ٹیپ ریکارڈر ملا تھا۔
یہاں ان کے پاس ذاتی ریڈیو آ گیا تھا۔ اس ریڈیو کی بھی ایک چھوٹی سے کہانی تھی۔ خاں صاحب کو ریڈیو کی
تھی۔ اپنے پروگرام کو مانیٹر کرنے کے لیے وہ کسی کے گھر جا کر اسے سننا گوارا نہ کرتے۔ کسی دکان پر باقاعدگی
سننے کی فرمائش نہ کر سکتے تھے۔ اپنا ریڈیو وہ مزنگ روڈ سے چلتے وقت خانہ آفتاب کو دے آئے تھے اور اسے
یسی بھی کبھی انہیں آ نہیں سکتا تھا۔

رب نے ان کی سن لی۔

ایک روز بھائی ابوالحسن آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا۔ جس پر میڈیم ویو بھی اس
تا تھا گویا کوئی پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ بھائی ابوالحسن پولیس میں تھے اور خاں صاحب کے پنکھے
ان سے ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ یہاں سمن آباد میں مجھے اس قدر معلوم تھا کہ ایک صاحب جو کھرج
ہیں اور ہر پولیسیے کی طرح دیر تک اپنی بات سمجھانے میں لگا دیتے ہیں' آیا کرتے ہیں۔ کئی بار خاں صاحب
سے آگے نہ بڑھتے۔ کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے اور پھر اپنی جیپ میں روانہ ہو جاتے۔ بعد
پولیس ہو گئے۔ ان کی بیگم سعیدہ جی سے بعد میں میری دوستی ہو گئی..... لیکن ابھی سب کچھ پردۂ غیب میں
آئی جی پولیس بھی نہ تھے۔

خاں صاحب ابھی تو اس ماحول کا حصہ تھے جسے بھول جانا خاں صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔ 36۔ جی پہنچ کر
باہر برآمدے میں چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ ان کی نگاہیں سامنے والی نیم دائرہ سڑک پر ہوتیں۔ وہ یہاں سے
دی سڑکوں پر جا نکلتے' کبھی وہ کے اس راستے پر جو وایا کوتوالی سے یونیورسٹی کی طرف جاتا تھا۔ کبھی 1۔ مزنگ روڈ
کالج والی سڑک پر سائیکل لے کر چلے جاتے..... کبھی مری کی پہاڑیوں پر کھو جاتے۔ ان کے لیے ہر جگہ ہر
بن باس بن جاتے جس میں یادوں کے علاوہ کچھ زندہ نہیں ہوتا۔

ایک تشفی ریاض محمود کی شکل میں موجود تھی۔

وہ شام کے وقت آ جاتا۔ تب اس کی سماعت ٹھیک تھی اور وہ بآسانی خاں صاحب کے ساتھ وقت گزار سکتا تھا۔
سنتا..... اپنی دن بھر کی مصروفیات بیان کرتا۔ دونوں شعبدہ بازوں کی طرح..... بازی گروں کی مانند کبھی ماضی
مستقبل میں چکا چوند پیدا کرتے رہتے۔

کبھی کبھی خاں صاحب کی گہری چپ سے پریشان ہو کر ریاض سوال کرتا۔

"خاں صاحب! کیا بات ہے آپ خوش نہیں لگتے۔"